اور بارش ہو



نوید ظفر کیانی

بسم الله الرحمن الرحیم

اور بارش ہو

(مجموعۂ کلام)

نوید ظفرؔ کیانی

مکتبۂ ارمغانِ ابتسام

http://naveedzafarkiani.wordpress.com
www.facebook.com/nzkiani

مشتری ہوشیار باش

کتاب کا نام	اور بارش ہو۔
شاعر	نوید ظفؔر کیانی۔
وضاحت	یہ نوید ظفؔر کیانی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے برقی کتاب کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

صفحات	۱۵۵
سالِ اشاعت	۲۰۱۸ء
سنِ اضافہ	۲۰۱۸ء
پبلشر	نوید ظفؔر کیانی۔

ویب سائٹ	http://naveedzafarkiani.wordpress.com
فیس بک	http://www.facebook.com/nzkiani
برقی ڈاک	nzkiani@gmail.com

ترتیب



پروردگار!

مجھ کو خوش آئے نہ ایسی روشنی پروردگار
جس سے چندھیائی ہوئی ہو آگہی پروردگار

تیرے رستے پر اگر چلنا نہیں آیا مجھے
پھر بھلا کس کام کی دیدہ وری پروردگار

کہکشاؤں، کائناتوں کی حقیقت کچھ نہیں
ایک تیری ذات نقشِ سرمدی پروردگار

سر تو پانچوں وقت جھکتا ہے نمازوں میں مگر
کاش پانچوں وقت ہی ہو حاضری پروردگار

عمر کے نقشے میں تیرے رنگ ہی بھرتا رہوں
بخش دے اِتنا شعورِ زندگی پروردگار

جیسی بندہ پروری تجھ میں ہے بندوں کے لئے
کاش ہو ہم میں بھی ویسی بندگی پروردگار

رابطہ جن سے نہیں ہوتا ہے تیرا استوار
اُن کی خود سے بھی نہیں وابستگی پروردگار

جو دعائیں مانگتا آیا ہوں سُن لی ہیں سبھی
اور وہ بھی جو رہی ہیں ان کہی پروردگار

میرے لفظوں پر رہے بس لاالٰہ کا نشہ
زائرِ کعبہ ہو میری شاعری پروردگار

نعت رسولِ مقبول ﷺ

روشن ہے کہکشاں کی طرح میری ذات آج
ہر پل سے چھن کے آنے لگی جیسے نعت آج

دل میں پروئے جاتا ہوں موتی میں ذکر کے
لو دے رہا ہے روح میں رنگِ حیات آج

ہے اسوۂ رسول ﷺ کا آئینہ سامنے
کھولی ہوئی ہے میں نے قراں کی لغات آج

حل ہو گیا ہوں ذکر و درود و سلام میں
مجھ سے سوا کہیں ہے مری کائنات آج

میلاد کی مہک سے معطر ہیں شش جہت
بادِ نسیم جیسی مری بات بات آج

یادِ نبی ﷺ ہے اور عجب کیفیت میں ہوں
جیسے گزر رہی ہو مدینے میں رات آج

کافی ہے عمر بھر کی کفالت کے واسطے
درکار ہے بس ایک نظر کی زکواۃ آج

جو فیض یاب مکتبِ عشقِ نبی ﷺ سے ہو
پا لے گا یہ زمانہ نظامِ ثبات آج



حسینؑ

دیکھ کر ظلم کی بڑھتی ہوئی یلغار حسینؑ
نعرۂ حق کی صدا بن گئے ہر بار حسینؑ

ارتقاء دھول کو بھی پا نہ سکی ہے جس کی
اوجِ انسانی کو وہ دے گئے معیار حسینؑ

زندگی بھر کی بھی عزت نہ ملی دشمن کو
اور تیرے لئے تاریخ کی دستار حسینؑ

چلنا چاہتا ہے ترے نقشِ قدم پر اور بس
جب بھی کرتا ہے کوئی کفر سے انکار حسینؑ

مقتدر بن نہیں سکتا ہے یہاں کوئی یزید
جب تلک ملتِ بیضا میں ہے بیدار حسینؑ

تیرا کردار ہے اِک ضرب شبِ ظلمت پر
تیرا پیغام ہے اِک چشمۂ انوار حسینؑ

جس کی ہیبت سے لرزتے ہیں زمانے کے خدا
ہر زمانے میں ترا نام وہ للکار حسینؑ

معجزِ عشق کا مظہر ہے شہادت تیری
ہر زمانے کے لیے دعوتِ ایثار حسینؑ

خطۂ پاک کے دشمن کو خبردار کرو
وقت کے پاس ہے اِک برہنہ تلوار حسینؑ

ابو بکر صدیقؓ

نبی ﷺ کے نطق کی خوشبو، ابو بکر صدیقؓ
رہے ہیں ساتھ بہر سو، ابو بکر صدیقؓ

ملا تھا ثانیِ اثنین کا لقب اُن کو
رسولِ پاک ﷺ کے بازو، ابو بکر صدیقؓ

کوئی نہ اُن کی طرح یارِ غار کہلایا
خلوصِ عشق سے مملو، ابو بکر صدیقؓ

ہر ایک رُخ سے منقش رہا ہے رنگِ ثبات
وہ ہیرے تھے ہمہ پہلو، ابو بکر صدیقؓ

تھے سب کے واسطے اِک سایۂ شجر جیسے
وہ نرم رو، وہ شکر خو، ابوبکر صدیقؓ

وہ روشنی کا نشاں ظلم کے اندھیروں میں
ہمیشہ صورتِ جگنو، ابوبکر صدیقؓ

کئی غلامی کی زنجیریں توڑنے والا
کئی ضعیفوں کا دل جو، ابوبکر صدیقؓ

وہ بت شکن تھے مسلمان ہونے سے پہلے
دبنگ نعرۂ یاہو، ابوبکر صدیقؓ

تمام جھوٹ کا بازار ہو گیا پتھر
بنے یوں صدق کا جادو، ابوبکر صدیقؓ

لے کے چلے تھے رند کہاں سے شامِ وعدہ
جس میخانے میں پیمانہ ہے نہ بادہ

اُس کا ملنا ناممکن ہے جانتا ہوں میں
باندھ لیا ہے پھر بھی اک ناکام ارادہ

تیرے کوچے نے گنجلا رکھا ہے کب سے
اپنے آپ سے ملنے کا ہر ایک ارادہ

تیری یادیں میرا جیون چاٹ رہی ہیں
جیسے برف نے پہنا ہو شعلوں کا لبادہ

اب بھی پرانے شہر کے رہنے والے اکثر
تنگ مکانوں میں رہتے ہیں، دل ہے کشادہ

ہر رستے نے دلدل کا بہروپ بھرا ہے
پھر بھی میں ہر نئی مسافت کا دلدادہ

دنیا پر ہی ڈالتے ہیں تنقیدی نظریں
کس نے دیکھا بہرِ دنیا اپنا افادہ

ظلمت نے طوفان اُٹھا رکھا ہے اس پر
یہ ننھی سی شمع کیوں ہے دُور افتادہ

میں اپنے دیوان کو دیکھ کے ہنس دیتا ہوں
لوگ پڑھیں گے لے کر یہ اوراقِ سادہ



یہ جو میں ہوں، کوئی دھوکہ ہی سہی، یونہی سہی
جسم کی قبر کا کتبہ ہی سہی، یونہی سہی

خاک پڑتی رہی کتنے ہی زمانوں کی مگر
زخم دل آج بھی تازہ ہی سہی، یونہی سہی

درودیوار سے لپٹا ہوا یہ سناٹا
شور کرتا ہوا قصہ ہی سہی، یونہی سہی

آخرِ کار مجھے راکھ تو ہو جانا ہے
ایک پل کے لئے شعلہ ہی سہی، یونہی سہی

غمِ دنیا بھی مرے دل کے سمندر میں گرا
آج کچھ درد زیادہ ہی سہی، یونہی سہی

کم سے کم اُس سے ملاقات تو ہو جاتی ہے
خواب، حجرے کا دریچہ ہی سہی، یونہی سہی

اِس کی چھاؤں تلے پرکھوں کے زمانے گزرے
ہر شجر صورتِ شجرہ ہی سہی، یونہی سہی

یاد آتا ہے کوئی ترکِ تعلق پر بھی
اور یہ بات ہمیشہ ہی سہی، یونہی سہی

مطمئن ہوں کہ کوئی تو مرا نگراں ہے ظفرؔ
میرے پیچھے میرا سایہ ہی سہی، یونہی سہی



متصادم نظریات ہوتے رہے
شہر بھر میں فسادات ہوتے رہے

آرزویں تھیں بلوائیوں کی طرح
خالی دل کے مکانات ہوتے رہے

اپنی نظروں کی ناخواندگی نہ گئی
ہر طرف سے اشارات ہوتے رہے

کتنے پیاروں نے بانٹا ہمیں عمر بھر
کتنے رشتوں میں خیرات ہوتے رہے

ظرفِ ساقی پہ سب کا تیقن رہا
خوار رندِ خرافات ہوتے رہے

جان ہاروں میں بٹتی رہی زندگی
لوگ نذرِ فتوحات ہوتے رہے

کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی یکسر زباں
آنسوؤں میں بیانات ہوتے رہے

آج اُن کو بھی شکوہ ہے حالات کا
جن کی مرضی کے دن رات ہوتے رہے

اپنی بے چہرگی پر نظر نہ گئی
آئینوں سے سوالات ہوتے رہے

ہائے دیمک یہ کیسی لگی ہے ہمیں
چلتے پھرتے مزارات ہوتے رہے

بھوک اُگتی رہی بام و در میں ظفرؔ
اور اونچے محلات ہوتے رہے



آتا ہے جنہیں جان سے جانے کا قرینہ
وہ لوگ بنا لیتے ہیں موجوں کو سفینہ

ہر صبح نے دیکھے ہیں مری آنکھوں میں ڈورے
بدلے نہیں اب تک میرے اطوارِ شبینہ

میں آج یہ کس عمر کی چوکھٹ پہ کھڑا ہوں
جیسے سرِ روزن ہو کھلے بال حسینہ

اک خواب کسی طور قضا ہوتا نہیں ہے
ہر رات چلا آتا ہے پنڈی میں مدینہ

کیا غم ہے جو اک پل کی بھی مہلت نہیں دیتا
کیوں سال برابر ہوا ساون کا مہینہ

ہر شخص نے پوچھا ہے سبب آنے کا مجھ سے
دیکھا نہ کسی نے میرے ماتھے کا پسینہ

وہ غم بھی ظفؔر میں نے قبا کی طرح پہنا
جس غم میں ملا ہے مجھے ہر غم کا دفینہ



کیا سپنا تھا؟

میری آنکھیں
ہر منظر سے ہو آئی ہیں
سب کوچے میں گھوم لیا ہے
ہر گوشے کو کھوج لیا ہے

کہیں نہیں وہ عکسِ رنگیں
کل جو یہیں تھا
اِس کوچے میں جلوہ فرما
ہر گوشے کے
ہر حصے میں جڑا ہوا تھا

کیا سپنا تھا؟

اگرچہ سمے کا جلال اوج پر ہے
قلندر دلوں کا دھمال اوج پر ہے

بیانِ دل و جاں ہے اشکوں کا خاصا
اِسی فن میں یہ برشگال اوج پر ہے

مری وحشتوں کا بھی شاہد ہے صحرا
یوں کہنے کو نامِ غزال اوج پر ہے

نشہ توڑ دینا ہے ساقی نے آخر
بھلے رقصِ جامِ سفال اوج پر ہے

ابھی مجھ کو جاں سے گزرنا نہ آیا
ابھی فکرِ آل و مآل اوج پر ہے

مسیح کو خودی کی ادائی نہ کرنا
بجا، خواہشِ اندمال اوج پر ہے

میں ساون کی صورت برس تو گیا ہوں
مگر ان کہی کا ملال اوج پر ہے

مرے حوصلے بھی کہاں ہارتے ہیں
اگر سلسلۂ جبال اوج پر ہے

مقابل ہے سب سے بڑا میرا دشمن
ظفرؔ خود سے جنگ و جدال اوج پر ہے



نگاہِ ہمرہاں سے اُڑ چکے ہیں
ہم اپنی شاخِ جاں سے اُڑ چکے ہیں

مرے کردار کا سایہ تھا جن پر
وہ منظرِ داستاں سے اُڑ چکے ہیں

تری نظروں کے ہالے میں تھے ہم بھی
مگر اب کہکشاں سے اُڑ چکے ہیں

تو پھر پیڑوں کے سائے کس لئے ہیں
پرندے جب یہاں سے اُڑ چکے ہیں

پروں میں تھا جنونِ آب و دانہ
کہاں پر ہیں، کہاں سے اُڑ چکے ہیں

زمینیں پاؤں سے سرکی ہیں جب سے
ہم اپنے آسماں سے اُڑ چکے ہیں

کسی کی یاد کے رنگین بادل
اگر تھے تو یہاں سے اُڑ چکے ہیں



طوفان اگر خاک نشینوں میں سے نکلیں
کفّارِ زمانے کے مدینوں میں سے نکلیں

ہم لوگ بچا سکتے ہیں غرقابی سے خود کو
کچھ بوجھ دلوں کے جو سفینوں میں سے نکلیں

فی الحال تو انسان کا ہے حقِ مسلّم
ممکن ہے کبھی لفظ مشینوں میں سے نکلیں

جو ہم کو دکھاتے ہیں بہت شانِ تغافل
کیا ہو جو وہی دل کے مکینوں میں سے نکلیں

یوں گیتیِ احساس کو زرخیز بنائیں
آئندہ زمانے بھی دفینوں میں سے نکلیں

آپ ہیں مصروف تو میں بھی بڑا مصروف ہوں
جو بہت مصروف ہیں اُن سے سوا مصروف ہوں

پاؤں سے باندھا گیا ہے زندگی بھر کا سفر
دائرہ در دائرہ در دائرہ مصروف ہوں

روز و شب کی جو ہو منشا، کرنا پڑتا ہے مجھے
میں زمانے میں مثالِ آئینہ مصروف ہوں

وقت کے ظلمت کدے میں ساتھ دے دے زندگی
تھام لے کچھ دیر کو میرا دیا، مصروف ہوں

میں دعاؤں کی طرح کب تک ہمکتا ہی رہوں
ڈھونڈ لے آ کر مجھے تیری سخا، مصروف ہوں

تیری آہٹ ہے کہ ہر جانب سے آتی ہے مجھے
اور میں چاروں طرف جاتا ہوا مصروف ہوں

ملنے کو دفتر چلا آیا ہے کیفِ برشگال
مجھ میں دستک دے رہی ہے کیوں گھٹا، مصروف ہوں



خموشی

خموشی گفتگو کرتی ہے
لیکن سننے والا ہو تو سُن پائے
بہت سی ایسی باتیں ہیں
جو کہہ بھی دیں
تو کانوں سے کبھی دل تک نہیں جاتیں
زباں کہہ کر بھی گونگی
اور
سماعت سُن کے بھی بہری

چلو آؤ۔۔۔ ذرا سی دیر کو خاموش ہو جائیں
مجھے وہ بات کہنی ہے
جو ہونٹوں تک نہیں آتی

تُو اور میں

تو جب سے گیا ہے، مرا جیون سے تعلق
اخبار کے بے ربط تراشے کی طرح ہے
اب چارہ گری کے لئے عیسیٰ کو بلائیں
بیمارِ محبت کسی لاشے کی طرح ہے

لب بستگان کو بھی گلہ کچھ نہ کچھ تو ہے
خاموشیوں میں رنگِ صدا کچھ نہ کچھ تو ہے

میں مانتا ہوں اُس نے مجھے کر دیا تباہ
اس میں مگر مری بھی رضا کچھ نہ کچھ تو ہے

فردوس تو ہے آخری ہچکی سے قبل بھی
یہ سلسلۂ ارض و سماء کچھ نہ کچھ تو ہے

جو میرے دل کی رُت ہے کسی پر کھلی نہیں
چہرے کا رنگ اِس سے جدا کچھ نہ کچھ تو ہے

احباب کی جدائی نے مارا نہیں تو کیا
گہرا نہیں ہے زخم دِلا! کچھ نہ کچھ تو ہے

لاحاصلی کے کتنے زمانوں سے ساتھ ہے
یہ جستجو کہ بعد از خلا کچھ نہ کچھ تو ہے

میں مطمئن تھا نام مٹا کر ترا مگر
دیوارِ جاں پہ پھر بھی لکھا کچھ نہ کچھ تو ہے

سورج نہیں، میں کرمکِ شب تاب ہی سہی
ظلمت میں اہتمامِ ضیا کچھ نہ کچھ تو ہے

منصف یونہی تو بارِ دگر سوچتے نہیں
اب کے ترے بیاں میں نیا کچھ نہ کچھ تو ہے

یوں تو ہیں شر پسند کڑی نظروں میں ظفؔر
پھر بھی ہوائے صدق و صفا کچھ نہ کچھ تو ہے

میری خاموشی کیا بنی آواز
گونجتی ہے گلی گلی آواز

خود سے سر پھوڑتی پھرے ناحق
اپنے گنبد میں گونجتی آواز

ایک زنجیر سے بندھے ہیں ہم
میری آواز ہے تری آواز

شہر بھر کی صدا بنی کیسے
میرے اندر دبی دبی آواز

چپ کا اِک سلسلہ ہے میرے بعد
میری آواز، آخری آواز

اُس نے آواز مجھ کو دی ہوتی
میرا رستہ بھی روکتی آواز

چپ کے روغن میں ڈوب ڈوب گئی
در و دیوار میں بسی آواز

کوئی اس کو سنے سنے نہ سنے
میرے جذبوں کی خود سری آواز

ہائے کس نے مجھے پکارا تھا
چاروں جانب سے آئی تھی آواز

خامشی کا طلسم تو ٹوٹا
ہے غنیمت ڈری ہوئی آواز

کرتا ہے آئینے کی صداقت سے ہی گریز
کر دے نہ وقت تیری حقیقت سے ہی گریز

بس میں نہیں کہ صورتِ حالات سے بچیں
بس میں نہ تھا کہ کرتے بغاوت سے ہی گریز

ترکِ وفا ہی ہجر کی تلخی کا ہے علاج
لیکن مجھے ہے ایسی سہولت سے ہی گریز

دستِ دھنک کی کیسی حراست میں آئے ہیں
کب سے ہے آپ اپنی ضمانت سے ہی گریز

دنیا نے ہائے، کیسا متنفر کیا اُسے
کرنے لگا ہے میری محبت سے ہی گریز

گمراہ کیوں کرے کوئی خوشبو بھی آن کر
جب ہے مرے یقیں کو بشارت سے ہی گریز

رستہ نہ کھوٹا کر دے کہیں رونقِ جہاں
اس واسطے ضروری ہے حیرت سے ہی گریز

پایاب پانیوں کے مسافر بنے ہیں ہم
اذہان کو ہے فکر کی ندرت سے ہی گریز

جا کر بھی میرے دل سے نہیں جائیں گے ظفرؔ
اب تو مہاجروں کو ہے ہجرت سے ہی گریز



مرا فون تو اُٹھاؤ!

یوں نہ خود میں چپ سی بھر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!
جو گلہ ہے مجھ سے کر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!

جو غبار سا ہے دل میں وہ نکالنا ہی بہتر
بھلے مجھ پہ تم بپھر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!

مجھے اپنا حال کہہ دو کہ کروں میں غم غلط کچھ!
مرے درد کی خبر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!

یوں الگ تھلگ رہو گی تو بڑھے گی اور الجھن
نہ لہو میں یوں بھنور لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!

مری زندگی سے چاہتی ہو اگر اُڑان بھرنا
میرے سارے بال و پر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!

یہ حقیقتوں کے دلدل کہیں کھا نہ جائیں تم کو
مرے خواب سے گزر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!

یہ جو دھوپ ہجر کی ہے، ہمیں رکھ نہ دے جلا کر
کوئی سایۂ شجر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!

میں بچھا کے آ رہا ہوں سرِ رہگذار یہ دل
تم اِسی پہ پاؤں دھر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!

یونہی ریشمی سے جیون پہ سمے کا بار کیوں ہو
مرا رنگِ باروَر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!

یہ جو بھیگی بھیگی رُت ہے، مری ذات کا ہے ساون
سو نوائے چشمِ تر لو، مرا فون تو اُٹھاؤ!



ہاتھ لگ جائے محبت کا قرینہ تو پھر؟
ہو نہ زائر کے لئے دل کا مدینہ تو پھر؟

ویسے لڑنے کو میں طوفاں سے بھی لڑ سکتا ہوں
ڈوب جائے میرے اندر ہی سفینہ تو پھر؟

میرے موسم تو مرے دل کے کلینڈر میں ہیں
دل کی تجسیم ہو ساون کا مہینہ تو پھر؟

اُس کی ہمراہی کی خواہش ہے سفر پر لیکن
ذکر سُن کر اُسے آ جائے پسینہ تو پھر؟

ظلمتِ شب کا گلہ رہتا ہے دیوانوں کو
بال کھولے ہوئے بیٹھی ہو حسینہ تو پھر؟

جذبۂ دل کی دھنک تو ہے زمانے بھر میں
اِک وہی مجھ کو سمجھ پائے کبھی نہ تو پھر

میں یونہی سونے کی کانوں میں رُلا پھرتا ہوں
اپنی مٹی کو سمجھ لے وہ خزینہ تو پھر؟

میں نے ہیرے کی تب وتاب کا کیا کرنا ہے
کوئی ہر سنگ چُنے بہر نگینہ تو پھر؟

میرے کردار کو افسانہ بدر جس نے کیا
ہو اُسی سے میری یادوں کا دفینہ تو پھر؟

کیسے ہر اوج تیقن سے مسخر ہو گی
خوفِ لغزش ہو اگر زینہ بہ زینہ تو پھر؟

غمِ ہستی میں لذت ہے؟ نہیں تو!
بہت جینے کی حاجت ہے؟ نہیں تو!

دیے سارے ہی بجھتے جا رہے ہیں
ہواؤں سے شکایت ہے؟ نہیں تو!

فضاؤں کی خموشی ہے معمہ
نئی رُت کی بشارت ہے؟ نہیں تو!

وہ حرزِ جاں کیوں بنتی جا رہی ہے
نہایت خوبصورت ہے؟ نہیں تو!

کہا جاتا ہے جس کو زندگانی
مسافت در مسافت ہے؟ نہیں تو!

اُسی کی طرح اُس سے روٹھ بیٹھوں
کچھ اس میں بھی قباحت ہے؟ نہیں تو!

جو آئینے میں میرے سامنے ہے
مری اُس سے شباہت ہے؟ نہیں تو!

میں کس مکڑی کا جالا بُن کے دیکھوں
اُسے میری ضرورت ہے؟ نہیں تو!

ابھی اپنا پتہ ملتا نہیں ہے
مری خود میں سکونت ہے؟ نہیں تو!

ظفرؔ ترکِ وفا جب کر چکے ہو
اب اس کے بعد فرصت ہے؟ نہیں تو!

اب تو آجا!

کب تک موت کی آڑ میں چھپ کر
ہجر کی لمبی ضد میں رہے گا
دیکھ اب موسم بدل چکا ہے
بارش تھک کر ختم بھی چکی ہے
اب تو پیارے!
تیری خاطر
رنگوں نے بھی تا بہ فلک اِک سیڑھی لگا دی
اب تو آجا!

کور نظروں میں آگہی کا محاذ
جیسے ظلمت میں روشنی کا محاذ

کس زمانے میں رہتے ہیں کہ جہاں
ہم نے دیکھا ہے ہر صدی کا محاذ

سانس بھر بھی جگہ نہیں ملتی
جب محارب ہو ہر گھڑی کا محاذ

کیسی کیسی ہواؤں کے آگے
سرِ گلشن کلی کلی کا محاذ

ہائے توحید والوں کے دل میں
کب سے قائم ہے بت گری کا محاذ

چاہے اپنا ہی خون کرنا پڑے
سر تو کرنا ہے زندگی کا محاذ

خود کو تج کر جو آئے تو دیکھا
پھر تھا درپیش دوستی کا محاذ

جب نہ مجبور کج کلاہ کریں
کیوں بنانا پڑے خودی کا محاذ

آپ ہیں سربکف سرِ میداں
میرے حصے میں شاعری کا محاذ



پت جھڑ کی رُتوں میں بھی مرے دل کو ہرا دیکھ
اُمید کو ہر شاخِ تمنا پہ کھلا دیکھ

ہریالی کا وجدان نکال اپنی زمیں سے
یہ کس نے کہا بہرِ نمو کوئی گھٹا دیکھ

توفیق ہو جینے کی تو جی لیتے ہیں یوں بھی
ویران سرائے کا کوئی تنہا دیا دیکھ

اُن کے وہی تیور، وہی زہراب نوائی
دل کا وہی اصرار کہ ناموسِ وفا دیکھ

ہر شے کی حقیقت کو سمجھنا ہے ضروری
جو تجھ کو نظر آتا ہے، تو اُس سے سوا دیکھ

آفاق کی وسعت کو سمجھ، حجرے بنا مت!
منظر کے جھروکوں سے کوئی اور فضا دیکھ

مسنون ہے صدیوں کے خلا پر بھی تفکر
لیکن جو تری ذات میں ہے وہ بھی خلا دیکھ

بے رنگ زمانے میں دھنک جاگ اٹھی ہے
بے نام خموشی میں مرا رنگِ صدا دیکھ



جن سے متروک رشتے ناتے ہیں
ہر سمے میں نشاں بناتے ہیں

ماتمِ تیرگی بھی اپنی جگہ
آؤ اپنے دیے جلاتے ہیں

یہ ترا ہجر، تیرا غم، توبہ!
آسماں دوش پر اُٹھاتے ہیں

کوئی پرواز کا جواز نہیں
ہم یونہی خود کو پر لگاتے ہیں

میں تو تجھ سے بچھڑ کے زندہ ہوں
لوگ جنگل میں کھو بھی جاتے ہیں

درِ میخانہ خود نہیں کھلتا
لوگ اپنی جگہ بناتے ہیں

کھینچ لی جب زمین قدموں سے
خواب کیوں چاند کے دکھاتے ہیں

کوئی چلتا ہو نیند میں جیسے
اپنی جانب یوں چل کے آتے ہیں

موسمِ ہجر آ کے جاتا نہیں
چھوڑنے والے چھوڑ جاتے ہیں

میں تو خود کو بھی بھول آیا ہوں
لوگ زادِ سفر بھی لاتے ہیں

زعم کیا ہو جراحتوں کا ظفرؔ
پھر نئے زخم مسکراتے ہیں



شکریہ اللہ میاں!

کتنی صدیوں کے اندھیروں سے نکالا ہے ہمیں
ڈوبتی امید تھے، پھر سے اُجالا ہے ہمیں
روشنی کے راستوں پر لا کے ڈالا ہے ہمیں
اُٹھ رہے ہیں پھر قدم
چل دیا ہے کارواں
شکریہ اللہ میاں!

رشتہ مستحکم ہوا ہے از سرِ نو اصل سے
سرخرو ہو جائیں گے ہم آنے والی نسل سے
سبز پرچم پھر سے لہرانا ہے تیرے فضل سے
بچھ رہی ہے ہر طرف
راستوں کی کہکشاں
شکریہ اللہ میاں!

غیر کے آگے نہ ہرگز ہاتھ پھیلائیں گے ہم
دنیا والوں کو اُبھر کر پھر سے دکھلائیں گے ہم
آگے، آگے اور آگے بڑھتے ہی جائیں گے ہم
اپنے مستقبل کی ہم
خود لکھیں گے داستاں
شکریہ اللہ میاں!



کس طور کی تشکیک کا شر کاٹ رہا تھا
سب میری دعاؤں سے اثر کاٹ رہا تھا

محفل میں مجھے اذنِ گویائی تو ملی تھی
کچھ کہنے سے بے نام سا ڈر کاٹ رہا تھا

گلشن کے خداؤں سے کوئی پوچھتا جا کر
کیوں حبس ہواؤں کے بھی پر کاٹ رہا تھا

ہر پھر کے اُسی سمت کو آ جاتے تھے آخر
قدموں کو کوئی راہگذر کاٹ رہا تھا

اِک ایسی عدالت بھی لگا لی تھی سمے نے
قاتل تھا کہ خود اپنا ہی سر کاٹ رہا تھا

منظر پسِ منظر کے جھروکے میں کہیں تھے
ہر گام کوئی وہمِ نظر کاٹ رہا تھا

میں شہرِ تمنا سے تو لوٹ آیا تھا لیکن
رہ رہ کے کوئی دیدۂ تر کاٹ رہا تھا

اب دھوپ میں جلتے ہوئے کڑھتا بھی وہی ہے
کل جو میرے رستے کے شجر کاٹ رہا تھا

کس سحر نے الفاظ کو دھندلا سا دیا تھا
کیوں اپنے ہی لکھے کو ظفؔر کاٹ رہا تھا



نظروں میں نہ آئے دل کی ٹوٹ پھوٹ، شکریہ!
مسکراتے چہرے کے سفید جھوٹ، شکریہ!

راستوں سے اپنے سب نقوشِ پا سمیٹ لو
میں بنا رہا ہوں آپ اپنا رُوٹ، شکریہ!

کیا خبر وہ ڈال آیا کس کے گھر میں کتنی چُپ
کہہ رہے ہیں جس کو دیکھ کر سلوٹ، شکریہ

میرے ہی بدن کو چکنا چور کر دیا، ارے!
مجھ کو ہی سمجھ رہے تھے تم اٹُوٹ، شکریہ

مدتوں سے مجھ پہ غفلتوں کی خاک ہے مگر
میرے بارے میں ہی ہو رہی ہے مُوٹ، شکریہ

بارہا دلیلیں لاجواب ہو کے رہ گئیں
میری خامشی نے کر دیا ہے ہوٹ، شکریہ

پھر مری نگاہیں چل پڑی ہیں تیرے ساتھ ساتھ
پھر پہن کے آ گئی ہو کالا سوٹ، شکریہ

-----ق-----

تیری مقناطیسیت نے کھینچ ہی لیا اے دل
آن پہنچا عشق کا وہ رنگروٹ، شکریہ

عمرِ بد لحاظ! تو نے کر ہی ڈالی آخرش
زندگی کے ساتھ میری سیلفی شوٹ، شکریہ!

بستیاں ہیں بھوک کے خمیر میں ڈھلی ہوئی
شاخچوں کے طشت پر دھرے فروٹ، شکریہ

آج بھی مرے خیالوں میں حنوط ہے ظفؔر
دور جاتے قدموں کی نوائے بوٹ، شکریہ



اور بارش ہو

حسرت حسرت خواہش ہو اور بارش ہو
پھر یادوں کی سازش ہو اور بارش ہو

ضبط کے بندھن توڑ کے نکلے بھید کوئی
اُن پلکوں میں لرزش ہو اور بارش ہو

دوڑتا ہو شریانوں میں تیزاب سا کچھ
قلب و نظر میں آتش ہو اور بارش ہو

ہجر کے بادل دل سے گزرتے جاتے ہوں
فون ہو، اُس کی پرسش ہو اور بارش ہو

اُس کی چپ میں لہراتی ہو قوسِ قزح
کچھ ہونٹوں میں جنبش ہو اور بارش ہو

دل کا فسانہ رُت کے رخساروں سے ڈھلے
بھیگی بھیگی کاوش ہو اور بارش ہو

ایک ہی صحرا ہو جیون کے رستے میں
ایک ہی غم کی یورش ہو اور بارش ہو

پھر سے کاغذ کی کشتی ہو، ہم تم ہوں
بچوں والی رنجش ہو اور بارش ہو



عشق گو باعثِ رفاہ نہیں
اس سے بہتر کوئی گناہ نہیں

میں بھی سچا ہوں کس زمانے میں
آئینے بھی مرے گواہ نہیں

دوڑ منزل تلک ہے قدموں کی
اس سے آگے تو جیسے راہ نہیں

اپنے دامن کے داغ دیکھ سکوں
اِس قدر حیطۂ نگاہ نہیں

خود سے اِتنا میں کیوں جھگڑتا ہوں
زندگی کوئی رزم گاہ نہیں

اب کھلا ہے یہ تیرے باغی پر
وہ تو اپنا بھی خیر خواہ نہیں

یہی ایمان ہے جواز مرا
میں کہیں پر بھی خواہ مخواہ نہیں

عرقِ انفعال چاہتی ہے
کوئی گیتی بھی بے گیاہ نہیں

وہ سدا گمرہی میں رہتے ہیں
جن کی محفل میں کج کلاہ نہیں

شب سے اپنی ہی جنگ ہے کوئی
چاندنی چاند کی سیاہ نہیں

خود کو دریافت کرنا باقی ہے
تیرے بارے میں اشتباہ نہیں



خود فریبی

اُس کے لئے بچھا دی ہے خوابوں کی کہکشاں
تسخیرِ کائنات کا دعویٰ نہیں دیا
اُس کو تھما دیا ہے رگِ جاں کا اِک سرا
دیگر حوالہ جات کا دعویٰ نہیں دیا

سحر کی شکل چمکیلی نہیں ہے
ابھی کچھ خاص تبدیلی نہیں ہے

یہاں خود پھیلتی ہے شوقِ آتش
ہوا کے ہاتھ میں تیلی نہیں ہے

کوئی صورت نہیں صورت گری کی
کہ مٹی اس قدر گیلی نہیں ہے

مرا دل یونہی مرجھانے لگا ہے
گرفتِ جاں بہت ڈھیلی نہیں ہے

زمیں کا عکس پا کر بھی، نہ جانے
فلک کی جھیل کیوں نیلی نہیں ہے

مری چپ کو سمجھ لیتا ہے کوئی
اگرچہ بات تفصیلی نہیں ہے

بالآخر جو تمھیں گھر لے گئی ہو
وہ راہ کچھ ایسی پتھریلی نہیں ہے

ترے اُڑتے ہوئے رنگ نے بتایا
حویلی اس قدر پیلی نہیں ہے

ظفرؔ جب مسئلے ہیں دنیا بھر کے
غزل کا ہے کو تمثیلی نہیں ہے



ملیں گے روز مگر سلسلہ نہیں دیں گے
لہو میں گھل کے بھی وہ ذائقہ نہیں دیں گے

ہماری خبروں میں ہر روز آئیں گے ظالم
بنیں گے سرخی مگر حاشیہ نہیں دیں گے

تعلقات کو یکسر ہی توڑ ڈالیں گے
ہمیں تو شک کا بھی وہ فائدہ نہیں دیں گے

تمہاری خوشبو بھٹکنے نہ دے گی ہم کو کبھی
یہ راستے تو ہمیں کچھ پتہ نہیں دیں گے

لہو میں جیسے بھنور بن گئے ہوں ہجر کے غم
سفر کو اور کوئی مسئلہ نہیں دیں گے

گزرتے جاتے ہیں چپ چاپ ابر کے ٹکڑے
یہ میری پیاس کو کیا حوصلہ نہیں دیں گے؟

وہ مشکلات میں رکھیں گے مبتلا ہم کو
سفر تو دیں گے مگر راستہ نہیں دیں گے

ترے خیال کے منظر کا حصہ بن کے بھی
سکوتِ شب کو نیا زمزمہ نہیں دیں گے

ہم اپنی قبر میں کر دیں گے دفن خود کو ظفرؔ
کسی کے ہاتھ میں اب تعزیہ نہیں دیں گے



ترمیم!

جانِ من! تری ازلی
بے رخی سے تنگ آ کر
آخرش بجنگ آمد
تیرے اس فدائی نے
دستورِ وفا میں ہی
اِک ترمیم کر لی ہے

کیا ترمیم ہے یہ تو
بعد کی کہانی ہے
لیکن یہ حقیقت ہے
جستجو نہیں تجھ کو
مجھ مجبور نے آخر
فیصلہ کیا ہے کیا!

ہائے، کیا کیا جائے
خوب جانتا ہے تو
میں نے تیرے بارے میں
جو ترمیم کرنی ہے
ہر مآل کار اُس کا
تیرے حق میں ہونا ہے



یہ کس کی یاد سے اُلجھی بلا ارادہ ہی
غزل سرا ہے خموشی بلا ارادہ ہی

اب اُس گلی سے مرا لوٹنا بھی ناممکن
چلا گیا تھا میں یونہی بلا ارادہ ہی

مری زمین کو سورج کوئی میسر ہے
یہ گھومتی نہیں پھرتی بلا ارادہ ہی

وہ حبس ہے در و دیوار سمٹے آتے ہیں
میں کھول دیتا ہوں کھڑکی بلا ارادہ ہی

نئی ہواؤں کو کُھلنے تو دو فضاؤں میں
لباس بدلے گی دھرتی بلا ارادہ ہی

بڑھا تھا ہاتھ تو درواہ کھولنے کے لئے
کسی نے گاڑی چلا دی بلا ارادہ ہی

کوئی نہ آئے گا سننے کے واسطے پھر سے
جو ختم کی تھی کہانی بلا ارادہ ہی

تعلقات کی زنجیر کاٹتے ہیں لوگ
کڑی تو خود نہیں کھلتی بلا ارادہ ہی

جو اُن کے لہجے میں در آئی تو عجب کیا ہے
گئے زمانوں کی تلخی بلا ارادہ ہی

یہ اب کھلا مرے سائے کی گھات میں تھی ظفرؔ
جو دھوپ پھیل رہی تھی بلا ارادہ ہی

حسرتِ سایہ میں جنگل کو تکے جاتا ہوں
دھوپ ہے اور میں آنچل کو تکے جاتا ہوں

ایسی شکنیں میرے ایقان میں کب آئیں گی
تیری پیشانی کے گنجل کو تکے جاتا ہوں

دور جاتی ہوئی گاڑی کا دھواں ہے اور میں
سرخ ہوتے ہوئے سگنل کو تکے جاتا ہوں

اپنے پہلو میں چبھی جاتی ہیں پتھر کی سلیں
اور ترے پہلو کے مخمل کو تکے جاتا ہوں

جب کسی ریت کی صورت ہے مری مٹھی میں
کیوں گزرتے ہوئے ہر پل کو تکے جاتا ہوں

یہ زمانہ بھی یونہی دیکھتا ہو گا مجھ کو
جس طرح میں کسی پاگل کو تکے جاتا ہوں

رونقِ شہر کا اِک میں ہی تماشائی ہوں
اپنے اطراف کے دلدل کو تکے جاتا ہوں

پھر مقدر میں لکھی ہے کوئی نا اُمیدی
پھر کسی آس میں گوگل کو تکے جاتا ہوں

بھری برسات کی بوچھاڑ ہے اور میں پیاسا
اِس چھلکتی ہوئی چھاگل کو تکے جاتا ہوں



جس میں چلنے کا حوصلہ سا ہے
وہ اکیلا بھی قافلہ سا ہے

کیا زمانہ ہے میرے حصے میں
مسکرانا بھی واقعہ سا ہے

لوگ دل کو یونہی بُرا نہ کریں
ہم کو خود سے بھی کچھ گلہ سا ہے

داغ ہیں ہر کسی کے دامن پر
اور ہر کوئی آئینہ سا ہے

گُل کھلاتی ہیں میرے زخموں سے
یہ بہاروں کا مشغلہ سا ہے

شک نے یوں تو نگل لیا جیون
کچھ سمے کا محاصرہ سا ہے

حوصلوں کو صدائیں دیتا ہوا
ہر پہاڑی پہ راستہ سا ہے

ہر بُرائی سے دشمنی ہی سہی
ایسا کرنے کا ضابطہ سا ہے

اب غمِ ہجر حلقہ در حلقہ
ایک بے انت سلسلہ سا ہے

یہ جوازِ سفر بھی کافی ہے
دشت کے پار گلکدہ سا ہے

پیڑ ہیں یا فسانے ہیں بکھرے ہوئے
راستے بھر زمانے ہیں بکھرے ہوئے

عکسِ کم مائیگی میرے گالوں پہ ہے
آنسوؤں کے خزانے ہیں بکھرے ہوئے

ہائے کیسی جدائی ہے احباب میں
جیسے مالا کے دانے ہیں بکھرے ہوئے

نئی تہذیب کی بھی بناء کچھ نہیں
نقش بھی سب پرانے ہیں بکھرے ہوئے

بے یقینی کا شب خوں سفر بھر رہا
رہبروں کے قیانے ہیں بکھرے ہوئے

کچھ تو پھسلن بچھا دی ہے مقسوم نے
اور کچھ بے دھیانے ہیں بکھرے ہوئے

تیر کی زد میں آ جائیں نہ خود کہیں
بلکہ سارے نشانے ہیں بکھرے ہوئے

وقت کو اپنے سانچے میں ڈھالا تو ہے
وقت کے تانے بانے ہیں بکھرے ہوئے

چہچہے کوچ کرنے لگے باغ سے
کیوں سبھی آشیانے ہیں بکھرے ہوئے



بہاروں کا سفر

میں شائد سو گیا تھا ریل گاڑی میں

نہ جانے کس نگر سے تھا
گزر میری مسافت کا
مرے اطراف میں رنگوں کی یورش تھی
کھلے تھے پھول ہر ہر رنگ کے ہر سو
عجب چہکاریں پھیلی تھیں
بہت سی تتلیاں اور بھنورے منڈلاتے دکھائی دے رہے تھے
دور تک مجھ کو

کھلی تھیں کھڑکیاں

اور تازہ خوشبو سے معطر تھیں ہوائیں بھی

سو ایسے میں مجھے بھی نیند سی کچھ آ گئی تھی تو عجب کیا تھا

کھلی تھی آنکھ میری شور کی آواز پر

میں ہڑبڑا کر ہو گیا سیدھا

تو آخر آ گیا تھا میرا اسٹیشن

مسافر اور قلی دوڑتے پھرتے نظر آئے

عجب شورش بپا دیکھی

میں سفری بیگ اپنا لے کے باہر نکلا

تو کیچڑ میں پاؤں دھنس گیا میرا

بہ دقت نکلا اِس بدصورتی سے میں

ہجومِ ناشناساں سے کسی مانوس سی آواز نے

مجھ کو صدا دی

تو میں جیسے کھل سا اُٹھا تھا

بہاریں رشتۂ احساس کی پابند ہوتی ہیں
چمن اذہان کے موسم میں کھلتے ہیں
مری بیداریوں نے مجھ کو رکھا ہے بہاروں میں
وہ رستے کی بہاراں تھی
یہ میری زندگی کی ہے
سو اُس خطے سے اپنے گھر تلک میں نے
بہاروں کا سفر دیکھا
بہاروں کا سفر کہ اب بھی جاری ہے



وقت گو بادل سا ہے
دِل سلگتے تھل سا ہے

اِس پہ بھی پیاسا ہوں میں
آسماں چھاگل سا ہے

موت ہے رُوئے حیات
درمیاں ململ سا ہے

رونقِ دنیا بجا!
دل مگر بوجھل سا ہے

زیست ہے شب کا سفر
ہر سمے جنگل سا ہے

وہ تو صدیوں بعد بھی
ایک گزرے پل سا ہے

کس کو سمجھاتا ہے تو
عشق تو پاگل سا ہے

دیکھ کر بھی نہ رُکا
راستہ دلدل سا ہے

داغِ رسوائی ظفرؔ
عشق کا طغرل سا ہے



آسماں بھول گیا خواب ہمارے کتنے
رُل گئے کوچہ و بازار میں تارے کتنے

خس و خاشاک سے الجھا رہا میرا دامن
موسمِ گل نے کیے ہوں گے اشارے کتنے

ہاتھ پاؤں نہ اگر ڈال دے ہمت تیری
اِسی گرداب سے اُبھریں گے کنارے کتنے

اُس گلی میں جو بتاشوں کی طرح بٹتے تھے
مجھ کو وارے میں لگے سارے خسارے کتنے

عمر کب تک کسی امید پہ کٹ سکتی تھی
ہاتھ سے چھوٹ گئے اب کے غبارے کتنے

میں ترے ہجر میں جی سکتا تھا کتنا آخر
آکسیجن نے دیے سانس اُدھارے کتنے

کب سے پھرتا ہوں ظفرؔ تہمتِ بینائی لیے
ایک منظر نے مگر روپ بھی دھارے کتنے



گردشِ دوراں میں یوں مقسوم ہیں
اپنی صحبت سے بھی ہم محروم ہیں

وقت کے اوراق سادہ ہی سہی
راستے میں پیڑ تو مرقوم ہیں

ہائے کن یادوں میں گرمِ سیر تھے
دوستوں کے قہقہے مغموم ہیں

وہ ہمارے قلب و جاں میں آج بھی
سانس لیتے ہیں مگر مرحوم ہیں

جا رہے ہیں، جائیں پر بھولیں نہیں!
آپ اور ہم لازم و ملزوم ہیں

جن سے تھا تصویر خانۂ زمن
آئینے کے سامنے معدوم ہیں

اور سب "مس فٹ" سے رہتے ہیں وہاں
جو مناظر آپ سے موسوم ہیں

کیا کہیں، بھٹکے ہیں وہ کیا سوچ کر
جن کو سارے راستے معلوم ہیں

وقت کے ماتھے پہ شکنیں پڑ گئیں
کل کے ظالم آج کے مظلوم ہیں



وہ آ نکلتا ہے میرے خوابوں میں مثلِ آہو بلا ارادہ
مرے خیالوں میں چھوڑ جاتا ہے اپنی خوشبو بلا ارادہ

یہ کس کی یادوں کے زلزلے ہیں کہ جسم و جاں ہل کے رہ گئے ہیں
یہ گریۂ شب نے کیسا بدلا ہوا ہے پہلو بلا ارادہ

غموں کی برکھا نے زندگی میں عجیب جلتھل سی کی ہوئی ہے
وجود ہی جیسے بن کے بہنے لگا ہو آنسو بلا ارادہ

یہ ہجر کے کیسے موڑ پر لا کے زندگی نے دھرا ہوا ہے
کہ اب تو اُڑنے لگے شجر سے سبھی پکھیرو بلا ارادہ

نہ ابرو اُس کے بہت کٹیلے، نہ نین اُس کے بہت نشیلے
کبھی کبھی کوئی کرنے لگتا ہے یونہی جادو بلا ارادہ

اُسے بھی اُکسا رہی ہے کیا ہمکلامی پر اُس کی کوئی وحشت
مری طرح آن نکلا ہے چاند بھی لبِ جو بلا ارادہ

وہ جس نے ناعافیت کی گردھند میں دھکیلا ہوا ہے مجھ کو
ہر ایک مشکل میں تھام لیتا ہے میرا بازو بلا ارادہ

ارادتاً شب نژادوں نے ظلمتوں کے جھنڈے اُٹھا لئے تھے
وہی ہے شب اور چمک رہے ہیں بہرسو جگنو بلا ارادہ

ظفرؔ کا خلوت کدۂ شب میں یہی تو اک مشغلہ ہے اب کے
سمے کے پاؤں سے باندھتا ہے سخن کے گھنگھرو بلا ارادہ



کتابِ جاں بمطابق نصابِ زیست نہیں
کہ تیرا نام سرِ انتسابِ زیست نہیں

کسی کے جبرِ محبت میں عمر کاٹی ہے
یہ ماہ و سال تو ہرگز حسابِ زیست نہیں

جواب جن کا دیا تھا بصد فشارِ لہو
سوال اب بھی وہی ہیں، جوابِ زیست نہیں

سب اپنے سود وزیاں کے مدار رکھتے ہیں
کسی کو فکرِ گناہ و ثوابِ زیست نہیں

ہم اپنے آپ سے انصاف کر نہ پائیں گے
ہمارے بس میں اگر احتسابِ زیست نہیں

اب اپنے خوابوں کی تجسیمِ نو ہی بہتر ہے
عبث ہے کاسہ کہ حاصل شرابِ زیست نہیں

تو کیا جیا کہ زمانے کو رنگ بھی نہ دیا
یہ سانس لینا تو لبِ لبابِ زیست نہیں

ابھی ہوں میں یا مرے خوابوں کے ستارے ہیں
ابھی افق پہ کوئی آفتابِ زیست نہیں

یوں کاٹتا ہوں خزاؤں کے دور کو میں ظفرؔ
کہ جیسے موسمِ گل بھی عذابِ زیست نہیں



جب ترا ہو کے نہیں رہ سکتا
کاش میں اپنے قریں رہ سکتا

پھوٹ پڑتی تھی وہیں قوسِ قزح
تم جہاں ملتے، وہیں رہ سکتا

ویسے پرواز کا موسم تو نہ تھا
پر فشاں اپنے تئیں رہ سکتا

خاک ہے خاک نشینوں کا جہاں
کس طرح عرش نشیں رہ سکتا

آدمی اپنی ہوسناکی سے
بچ نکلتا تو حسیں رہ سکتا

سرخرو زیست سے کیا ہونا تھا
ایک لمحے کا امیں رہ سکتا

کاش مجبوری سمجھ کر تیری
میں بھی تھوڑا سا کہیں رہ سکتا

بھول جانے کا گماں ٹھیک نہیں
کچھ تو خود پر بھی یقیں رہ سکتا

آسمانوں سے اُتر آیا تھا
بسکہ در خاکِ زمیں رہ سکتا

دل کی پرواز کہاں ٹھہری ہے
میں یہاں تھا تو یہیں رہ سکتا

جاں سے جانا ہی مرا بنتا تھا
ہر مکاں میں نہ مکیں رہ سکتا

دل یوں بے چہرہ نہ ہوتا جو ظفرؔ
ہجر کا رنگِ حزیں رہ سکتا



لو دے رہی ہے آگہی عہدِ سیاہ میں
دھندلا ہے پھر بھی آدمی عہدِ سیاہ میں

قلب و نظر میں کیسے اندھیروں کا سحر ہے
کیا بانٹتی ہے چاندنی عہدِ سیاہ میں

اپنی مسافتیں بھی اُسی کہکشاں پہ ہیں
جس کی زمیں ہے دلدلی عہدِ سیاہ میں

آنکھوں کو خلق روزنِ در نہ بنا سکی
دنیا ہے ایک کوٹھڑی عہدِ سیاہ میں

اِک ان کہے سے خوف سے برفاب تھا لہو
بجتی رہی تھی دف کوئی عہدِ سیاہ میں

رکھا ہوا ہے وقت نے سورج کو طاق پر
کیا جی رہے ہیں پھر کسی عہدِ سیاہ میں

اِک جبرِ بے نیاز کی مٹھی میں قید ہے
خوابِ سحر کی روشنی عہدِ سیاہ میں

کیا کیا دھواں دھواں ہو ہمارا یہ دور بھی
لگتی ہے جب سبیل سی عہدِ سیاہ میں

اب کے بیاضِ وقت میں کرنیں رقم کروں
گویا ہے میری نوکری عہدِ سیاہ میں



لو پھر سے خود میں غرفۂ امکان کھول کر
ٹیرس پہ آ گیا ہوں گریبان کھول کر

ہر ساعتِ ورق پر تجربوں کے نقش تھے
لیکن پڑھا نہ زیست نے دیوان کھول کر

سناٹے میرے گھر کے بھی کچھ بولتے ہیں کیا
دیوار سُن رہی ہے جسے کان کھول کر

جلووں کا اِک طلسم ہے اور چشم ہائے شوق
بیٹھی ہوئی ہیں مصحفِ قرآن کھول کر

منزل نے آپ آن کے دینی نہیں صدا
منزل کشید کرنی ہے بحران کھول کر

انگاروں پر چلے گا تو گلزار پائے گا
مشکل نہ ڈھونڈ جادۂ آسان کھول کر

بڑھتے ہوئے قدم کو پلٹنا نہ آئے گا
کر باز نہ درِ دل مری جان کھول کر

میرے لئے تو ایک علامت اماں کے ہیں
وہ خواب بھی جو لے چلے طوفان کھول کر

یادوں کو کھوجنے کا جنوں ماند نہ ہوا
ہر روز دیکھتا ہوں یہ سامان کھول کر

وہ گھڑ سوار آ کے چلا بھی گیا ظفرؔ
منظر کھڑا ہے دیدۂ حیران کھول کر



معرکۂ حیات ہے درپیش
دمبدم کوئی گھات ہے درپیش

میرے آنسو تو خشک ہو بھی چکے
اب غمِ شاملات ہے درپیش

سانس کی آنچ آ رہی تھی مگر
دوریٔ شش جہات ہے درپیش

بجھنے دیتا نہیں ہے یہ احساس
ہر نفی کو ثبات ہے درپیش

ساری دنیا سے میں نمٹ لوں گا
پر جو یہ اپنی ذات ہے درپیش

چاند اس ڈر سے کیا نہیں نکلے
اُس کو اک لمبی رات ہے درپیش

خود کو پانے کا مرحلہ ہے یہی
وسعتِ کائنات ہے درپیش

اعتبار اب کسی قدم کا نہیں
عالمِ ممکنات ہے درپیش

مضمحل ہو گیا سرورِ فتح
اپنے دشمن کی مات ہے درپیش



فاروقِ اعظمؓ

اسلامیوں کا اک نقشِ اسلم
ہونے نہیں دی لوحق کی مدھم
کعبہ میں سربسجدہ تھا ضیغم
فاروقِ اعظمؓ

ایمان دے کر تجھ سے ولی کو
تحفہ دیا تھا رب نے نبیؐ کو
تحریک کر دی کچھ اور محکم
فاروقِ اعظمؓ

بہرِ وفا تھی جاں بر ہتھیلی
ہر جنگ میں تھا آقاؐ کا ساتھی
تیغِ فساں تھی بے چین ہر دم
فاروقِ اعظمؓ

قیصر نہ کسریٰ ٹھہرا مقابل
ہر رن میں تجھ سے ہارا تھا باطل
اسلام کا اک لہراتا پرچم
فاروقِ اعظمؓ

الفاظ بخشے تو نے اذاں کو
گویا بڑھا دی قندیل کی لو
تا حشر گونجے گا جس سے عالم
فاروقِ اعظمؓ

انصاف تیرا بے مثل ٹھہرا
تاریخ پر تھا اِک نقش گہرا
گفتار بے لاگ، کردار مبرم
فاروقِ اعظمؓ

کیوں ظلمتوں میں کھویا ہوا ہو
روشن ہمارا بھی راستہ ہو
کچھ لو تمھاری پالیں اگر ہم
فاروقِ اعظمؓ



جس کے دل میں ہے تو جاگزیں اُس کی ہے
جس کے قبضے میں ہے یہ زمیں، اُس کی ہے

گویا دونوں ہیں تسکین کی موج میں
پیاس میری ہے اور انگبیں اُس کی ہے

جیسے چلتا ہو دل والا انگاروں پر
ہائے دنیا بڑی آتشیں اُس کی ہے

جو بھی رہ ہے سو مارِ زمانہ شدہ
جو بھی سبزہ ہے اب کے کمیں اُس کی ہے

ڈنک مجھ کو لگے تو کسے دوش دوں
سانپ اُس کا ہے نہ آستیں اُس کی ہے

حسن منت کشِ مال و زر تو نہیں
کیوں سمجھتا ہے ہر شے حسیں اُس کی ہے

میرے لہجے میں ہے دردِ ہجراں کوئی
میری غزلوں میں مشکِ حزیں اُس کی ہے

کہکشاؤں میں کیوں پھر رہا ہے ظفؔر
مجھ سے پوچھو تو جنت یہیں اُس کی ہے



تیرا غم ہے مرے اشکوں میں جمع
کوئی سیلاب ہے آنکھوں میں جمع

جن سے کترا کے گزرنا تھا مجھے
ہو گئے سارے ہی رستوں میں جمع

کس تماشے کی توقع پر ہے
شہر کا شہر دریچوں میں جمع

بعض ہیں مٹی میں مل کر مٹی
بعض ہیں چاند ستاروں میں جمع

خود کو منہا نہیں کرتے خود سے
یوں نہ ہو پاؤ گے اوروں میں جمع

پاؤں دھرتے ہوئے ڈر لگتا ہے
سانپ ہیں خاک کے رنگوں میں جمع

سائے پھرتے ہیں گلی کوچوں میں
آدمی سارے ہیں بینکوں میں جمع

اُس کا محصول بھی جیون نے دیا
جو نہ تھے میرے اثاثوں میں جمع

زندگی ہو گئی مصرع مصرع
میری غزلوں میری نظموں میں جمع



پاکستان

جہاں جاتے ہیں پاکستان کو ہم ساتھ رکھتے ہیں
سرِ دیدہ و دل ایمان کو ہم ساتھ رکھتے ہیں

کبھی ریجھے نہیں لندن کی مصنوعی بہاروں پر
کبھی پھسلے نہیں پیرس کی چکنی رہگذاروں پر
سدا اہلِ وطن کے مان کو ہم ساتھ رکھتے ہیں

یوں گردش میں ہمیں رکھتی تو ہے روزی کی مجبوری
پر اس کے پیار میں مانع نہیں ہے کوئی مجبوری
کراچی، پنڈی و مردان کو ہم ساتھ رکھتے ہیں

اِسی کے واسطے تن من کیا قربان آباء نے
بنایا تھا اسی کے پیار کو ایمان آباء نے
سو جیون بھر اُسی رومان کو ہم ساتھ رکھتے ہیں

جہاں بھی ہوں اسی کے نام کا نعرہ لگاتے ہیں
کہیں کا آسماں ہو چاند تارہ ہی سجاتے ہیں
یہی ہے اور اسی پہچان کو ہم ساتھ رکھتے ہیں

اِسی مٹی سے اُٹھے ہیں، اِسی مٹی میں ملنا ہے
یہی دھرتی ہے اب جس پر بکھرنا اور کھلنا ہے
اسی کے نام ہر وجدان کو ہم ساتھ رکھتے ہیں

سوچ کی بے خوابیوں کے سلسلے، میں اور چراغ
زندگانی کے بہت سے مسئلے ،میں اور چراغ

کیا ہوا یکلخت ہم کو، صبح تک جلنا تو تھا
بجھ گئے کیوں دیکھتے ہی دیکھتے میں اور چراغ

آسماں پر جلتی بجھتی کہکشاؤں کے ہجوم
اور کب سے خود کو خود میں ڈھونڈتے میں اور چراغ

میٹھی میٹھی وصل کی یادوں کی ہر سو آہٹیں
تلخ ہوتی ساعتوں کے ذائقے، میں اور چراغ

دمبدم بے نام سی پہچان کے اوہام سے
چار جانب آئینے ہی آئینے، میں اور چراغ

اپنی اپنی آنچ پر جلتے ہوئے، بجھتے ہوئے
اپنے اپنے طاق پر رکھے ہوئے، میں اور چراغ

دور تک پھیلی ہوئی انگنائی کی تنہائیاں
دستکیں دیتے ہوئے کچھ واہمے، میں اور چراغ

ہر سمے میں تھرتھراتے خوف کی بجتی دفیں
آنے والے کل کی بابت سوچتے، میں اور چراغ

لفظ کمرے کے درو دیوار سے رِستے ہوئے
ایک روشن سی غزل کے قافیے، میں اور چراغ



شرپسند

معززینِ وطن پر اُٹھاتا ہے انگلی
یوں شرپسندوں میں خود کو شمار کرتا ہے
عجب عجب کہ نہیں جرمِ حق پہ شرمندہ
غضب غضب کہ بصد افتخار کرتا ہے

ہمیشہ سربلند پندار رکھ دو
بدن پر سر نہیں دستار رکھ دو

اگر قیمت نہیں ہے خار و خس کی
بہ عنوانِ گل و گلزار رکھ دو

بہت سی باتیں ہو سکتی نہیں ہیں
خموشی کو پئے گفتار رکھ دو

پھرو گے زرد موسم میں کہاں تک
اِسی منظر میں کچھ اشجار رکھ دو

مجھے تو ساتھ سورج کا بہت ہے
تم اپنا سایۂ دیوار رکھ دو

لگوں نہ اجنبی خود سے نکل کر
دھانے پر نیا اک غار رکھ دو

حوادث تو سکوں کی گھات میں ہیں
لہو میں پھر کوئی منجدھار رکھ دو

جنونِ آبلہ پائی ہے کیسا
سفر اندر سفر ہر بار رکھ دو

مرا تو میرا اللہ ہے محافظ
سفینوں کے لئے پتوار رکھ دو



جان ہاروں کو سلام

اے وطن تیرے فلک کے سب ستاروں کو سلام
جو ظفر مندوں میں ہیں اُن جان ہاروں کو سلام

قوم کے کل کے لئے سب آج اپنا تج گئے
جل بجھے جو دھوپ میں اُن سایہ داروں کو سلام

راہِ سنگ و خشت کو جانا ہے مثلِ کہکشاں
دم بہ دم بڑھتی ہوئی روشن قطاروں کو سلام

جن کی دہشت ہے عدو پر، اُن کی ہمت کو خراج
جن کا ڈنکا جگ میں ہے، اُن نامداروں کو سلام

نعرۂ تکبیر کی آواز پر لرزاں عدو
جذبۂ شوقِ شہادت کی بہاروں کو سلام

ان کے آگے ہیبتِ طوفان مشتِ خاک ہے
عزمِ عالیشان کے اِن کوہساروں کو سلام

وارثانِ سرفروشی حسینؓ ابنِ علیؓ
دشمنوں پر کوندتی اِن ذوالفقاروں کو سلام

وہ زمیں ہو، آسماں ہو، دشت ہو یا بحر ہو
ہر محاذِ جنگ کے ان جانثاروں کو سلام

یہ اکیلے ہیں، کہاں اِک قوم ان کے ساتھ ہے
عالمِ اسلام کے اِن تاجداروں کو سلام

یہ زمامِ وقت کو رکھتے ہیں ہاتھوں میں ظفرؔ
اِن حیاتِ جاوداں کے شہسواروں کو سلام



کسی کو دل کی کوئی فکر ہی نہیں شائد
کہ پہرے پر تو کوئی سنتری نہیں شائد

نظر کے رنگ ہیں جو شاعری سی کرتے ہیں
دھنک میں اپنی کوئی دلکشی نہیں شائد

ترے خیال نے مجھ کو اُجال رکھا ہے
مرے چراغ میں تو روشنی نہیں شائد

ہوا میں یوں تو بہت کچھ لکھا ہے بادل نے
یہ اور بات، ہے یہ تشنگی نہیں شائد

سب اپنے سر پہ سرِ نیزہ دھرے ہوئے نکلے
دوانوں میں ہوسِ زندگی نہیں شائد

مرا زمانہ بلاؤں کی چھاؤنی ٹھہرا
کسی کے بازو میں تعویذ بھی نہیں شائد

سب اپنے بچوں میں اُگنے لگے ہیں ازسرِ نو
ابھی یہاں پہ کوئی آخری نہیں شائد

ہوا کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے زمانے نے
مسافروں کو غمِ آگہی نہیں شائد

شجر میں شاخیں نہیں، گھات میں سپولے ہیں
پرندوں کو تو اماں آج بھی نہیں شائد

کئی برس سے تموج کا کوئی عکس نہیں
کہ پانیوں میں کوئی جل پری نہیں شائد

کیا ہوا ہے ترے غم نے بے دخل مجھ کو
مرے بدن میں مری روح ہی نہیں شائد

مری حدود ہیں ڈورِ نفس سے وابستہ
کہ اختیاری مری بے بسی نہیں شائد

مری زمیں پہ محل تو بہت ہیں خوابوں کے
مگر فلک کی کوئی جھونپڑی نہیں شائد



شیشہ گروں سے اُن کے نظاروں کی بات ہے
گویا مجاوروں سے مزاروں کی بات ہے

میں کر رہا ہوں اپنے ماہ و سال کا حساب
یا خود سے دُور جاتے غباروں کی بات ہے

پاؤں کبھی زمین پہ جم نہ سکے مرے
دعووں میں یوں تو چاند ستاروں کی بات ہے

منزل کا سودا سب کو سرِ رہگذار تھا
منزل پہ پھر سے راہگذاروں کی بات ہے

بھولے سے بھی ہوا نہ کبھی میرا تذکرہ
یوں انجمن میں درد کے ماروں کی بات ہے

یہ کس مقام پر مجھے لے آئی زندگی
خود اپنے سائے سے ہی سہاروں کی بات ہے

جنگل کی آگ سے کسے استثنا مل سکا
میرا ہی ذکر کب ہے، یہ ساروں کی بات ہے

آتش بہار کی ہے یا اُس گل بدن کی ہے
شعلے لپک رہے ہیں چناروں کی بات ہے

میرے لئے مسافت کہیں کی نئی نہیں
جو مجھ میں کھو گئے اُن دیاروں کی بات ہے

میں اپنی آگہی کو کہاں لے چلوں ظفرؔ
ہر سو بھنور گزیدہ کناروں کی بات ہے

مرا جیون ہے خود میری کہانی سے بھی آگے کا
فسانہ ہوں حیاتِ جاودانی سے بھی آگے کا

تمھاری کال آتی ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہوں
نشہ رہتا ہے شامِ ارغوانی سے بھی آگے کا

نہ جانے کیا ہوا کہ پھر کوئی بسنے نہیں پایا
یہ دل ہے اِک مکاں تیری نشانی سے بھی آگے کا

کسی کی موت بھی متروک کر سکتی نہیں اِس کو
محبت سلسلہ ہے زندگانی سے بھی آگے کا

خموشی کی زباں کا ترجمہ بھی ہو رہا ہوتا
اگر ابلاغ ہوتا ترجمانی سے بھی آگے کا

بہت سے قرض ہیں اندوہِ انسانی کے بھی تم پر
کبھی سوچا کرو سوزِ نہانی سے بھی آگے کا

زمیں کی قید سے اب تک رہائی مل نہیں پائی
سفر رکھا ہے سقفِ آسمانی سے بھی آگے کا

پروں میں باندھ رکھی ہے مسافت خود کو پانے کی
ارادہ ہے فلک کی میہمانی سے بھی آگے کا

ظفرؔ حدِ نظر تک کی بصارت کا فسوں توڑو
تمھیں تو سوچنا ہے لامکانی سے بھی آگے کا



عین شین قاف

نس نس کا اعتراف، وہی عین شین قاف
مجھ میں ہے صاف صاف، وہی عین شین قاف

کب سے کئے ہی جاتا ہے میرے وجود کے
ہر خلیے میں شگاف، وہی عین شین قاف

اِک نور کے نفوذ سے میں جگمگا اُٹھا
ہے محو انعطاف، وہی عین شین قاف

تیری ہوس ہے شوکتِ اِندر کی جستجو
میرا تو کوہِ قاف، وہی عین شین قاف

جب چاہا اپنی روح کی تفہیم مل گئی
ہر بار انکشاف، وہی عین شین قاف

گویا تمام روح کے جالے اُتر گئے
اندر سے کر دے صاف، وہی عین شین قاف

دھڑکن کی تال تال اُسی نام کی دھمال
اعلانِ واشگاف، وہی عین شین قاف

دل تو ہے حمد کی اِک کتابِ مقدسہ
اور اُس کا ہے غلاف، وہی عین شین قاف

تنہائی اُس کے نام کے چلّے کا نام ہے
اور کیا ہے اعتکاف؟ وہی عین شین قاف

یہ رونقِ بازار، یہ رنگینیٔ حیات
بس ایک اختلاف، وہی عین شین قاف

اُس کا خیال کعبۂ جاں ہے بنا ہوا
سرشاریٔ طواف، وہی عین شین قاف



ہوس تو سب کی نگاہوں میں جھلملاتی ہے
خوشی ہمیں ہے بدن کیوں سدا چراتی ہے

زمانہ رہتا ہے اِک شورشِ دُخان میں گم
تری صدا ہے جو مجھ میں دیئے جلاتی ہے

یہ چاند سب کی چھتوں پر اُترتا ہے شائد
نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے، میرا ذاتی ہے

کہاں بقائے محبت کے جام اور کہاں میں
مجھے یقیں ہے ، مرا کیس نفسیاتی ہے

چھپا ہوا ہوں کسی یاد کے دھندلکے میں
مری تلاش میں دنیا کی بے ثباتی ہے

تو کیا میں پھر سے فریبِ امید میں آجاؤں
یہ شام پھر مرے خوابوں کو گدگداتی ہے

وہ کائنات مرے حجرۂ بدن میں بھی ہو
جو میری فکر کو لے کے اُڑتی جاتی ہے



رہگزاروں میں ہمیں نکلنے نہیں دیتا ہے اپنے اپنے گھر کا اشتیاق
گھر میں ہوں تو کھینچنے لگتا ہے قدموں کو کسی اندھے سفر کا اشتیاق

زندگی بھر جن کو توفیقِ شجر کاری نہیں ہو پائی ہے، اُن کو بھی ہے
دھوپ کا مقتل بنی راہوں میں سستانے کو چھاؤں کے ثمر کا اشتیاق

کیا خبر کہ فصلِ گل نے ڈیرے ڈالے ہیں سرِ راہ ہے بھلا کس کے لئے
دید کے قابل ہے، منظر کے گلے لگتا، نگاہِ بے خبر کا اشتیاق

روشنی کے واسطے جلنا نہیں آیا تو سب دیوانگی کارِ عبث
یہ بجا کہ خواب زادوں کو رہا ہے رات بھر یوں تو سحر کا اشتیاق

کیا کہوں کیسے اجڑتے جا رہے ہیں دوستو! اندر ہی اندر سے سبھی
شہر کے لوگوں میں بڑھتا جا رہا ہے جس قدر دیوار و در کا اشتیاق

اپنے ابلاغِ خموشی پر مرا تو اس قدر ایمان مستحکم ہوا
بولنے دیتا نہیں مجھ کو تمھارے سامنے عرضِ ہنر کا اشتیاق

شوق کے پر کاٹنے آئے نہیں ہیں زندگی کے منتظم کو آج تک
ہم کہ جس رنگ میں بھی رنگے جائیں، رہتا ہے کسی رنگِ دگر کا اشتیاق

اب تو ساحل کی طرف جانے نہیں دیتی کسی صورت بھی ہم کو، کیا کریں
ہم کو تو لگتا ہے کہ جیسے ہماری کشتی کو ہے خود بھنور کا اشتیاق

جانے کس اظہار کے جذبے کی حدت سے لہو کا لاوا ہے کھولا ہوا
جانے کس حسرت میں رخساروں سے ڈھلکا جا رہا ہے چشمِ تر کا اشتیاق



وہ دُور نہ کر سکا ہو جب میری ہچکچاہٹ تو کیا کروں میں
ابھی بھی جھاڑی سے آ رہی ہو جو سرسراہٹ تو کیا کروں میں

اگرچہ طوفاں گزر چکے ہیں، ہم اپنی خندق کو بھر چکے ہیں
مگر ہواؤں میں آئے جاتی ہو سنسناہٹ تو کیا کروں میں

میں اُس کی بے سمت جستجوؤں سے بچ نکلنا تو چاہتا ہوں
تمام عالم میں گھول بیٹھا ہو اپنی آہٹ تو کیا کروں میں

میں اپنی جانب سے اُس کو مغلوب کر کے بیٹھا ہوا ہوں خوش خوش
وہ چھین لے مجھ سے میرے ہی دل کی چوہدراہٹ تو کیا کروں میں

یہ مانا اُس کے سوا کسی سے طمانیت مل نہیں سکے گی
اُسی نے چھینی ہوئی ہو میری جو مسکراہٹ تو کیا کروں میں

بہار آئے تو اپنے رنگوں کو، خوشبوؤں کو میں کیسے روکوں
وجود میں کوئی بھر دے آ کر جو گنگناہٹ تو کیا کروں میں

یہ فیصلہ ہے کہ اب مکاں میں کسی کو رُکنے نہ دوں گا ہرگز
مگر درِ دل پہ ہوتی جائے جو کھٹکھٹاہٹ تو کیا کروں میں

میں چاند سے کرنا چاہتا تھا، بہت سی باتیں، بہت سے شکوے
جو ٹھہرے پانی میں بھی نہ روکے یہ کسمساہٹ تو کیا کروں میں

جلا ہوں میں جتنی دیر تک، روشنی تو ہوتی رہی ہے تب تک
نویدؔ دائم نہ ہو چراغوں کی جگمگاہٹ تو کیا کروں میں



منتظر کب سے ہے مری تخلیق
رنگ دے مجھ کو بھی وہ دستِ شفیق

اِس طرح بھی نہ کر فسانہ بدر
کہ ہو دشوار اپنی ہی تصدیق

کھوجتا ہے جو اِک حوالے کو
ابر کی آس میں ہے قلبِ حریق

غم کو چہرے پہ کب سجاتے ہیں
مسکرانا ہے دل زدوں کا طریق

کر کے اِک دوسرے سے صرفِ نظر
لوگ رہتے ہیں گفتگو میں غریق

کبھی تنہا نہیں رہا کرتے
اپنی تنہائیوں کے آپ رفیق

چھان بھی میں چکا ہوں دشتِ حیات
اور چاہتا ہوں تیری بھی توثیق

فیصلہ اب اسی کے ہاتھ میں ہے
بن گیا ہے جو خود بھی ایک فریق

ہائے ہم کس ہجوم میں تھے ظفرؔ
خود کو جھٹلایا تو ہوئے صدیق



کہکشاں جیسی رہِ ادراک ہو جائے گی کیا
میری آہٹ برسرِ افلاک ہو جائے گی کیا

پھول رنگ و بو کے میلے ہی سجا نہ پائیں گے
فصلِ گل بہرِ خس و خاشاک ہو جائے گی کیا

مجھ سے کھلتا ہی نہیں گنجل کسی بھی ربط کا
تو یہ تنہائی مری املاک ہو جائے گی کیا

قید کر لے گی مجھے مٹھی میں میری ہی انا
مجھ سے بھی اونچی مری یہ ناک ہو جائے گی کیا

گرد بادِ وقت میں تخصیص کی خو بو کہاں!
وہ جو سونے سے بنی ہے، خاک ہو جائے گی کیا

تیرا سودائی فقط سر پھوڑتا رہ جائے گا
یہ تری چپ اِس قدر سفاک ہو جائے گی کیا

محنتانہ اپنی ہی تقدیر سے ملتا نہیں
اپنی مزدوری بھی ہم کو شاک ہو جائے گی کیا

ایک طغیانی ہے جس سے سب کا سب کچھ بہہ گیا
میری دھرتی کی یہی پوشاک ہو جائے گی کیا

فصل خود اپنے سروں کی گروی رکھوا کر ظفؔر
خلق محوِ طرۂ پیچاک ہو جائے گی کیا



جن کے پیچھے میں نے جانا آج تک اپنی حقیقت کو بھی ژاژ
کس قدر ظالم ہیں وہ، کہتے ہیں اب میری محبت کو بھی ژاژ

وقت کے صیّاد نے اُن کو کتر ڈالا ہے کیسے کیسے، ہائے!
جن اُڑانوں نے سمجھ رکھا تھا اِس بے انت وسعت کو بھی ژاژ

تیرے غم نے تو نقوشِ روز و شب کو ہی بدل ڈالا ہے جاں!
اِک بگولے نے بنا کر رکھ دیا جینے کی فرصت کو بھی ژاژ

ہر دفعہ اِک منظرِ نو کے تجسس میں ہوا گرمِ سفر
ہر دفعہ اِک جلیسی کلفت نے کیا ہے میری ہجرت کو بھی ژاژ

ہر سمے کے خیمے میں ہم نے جما رکھنی ہے محفل ذکر کی
دیکھنا، ہونے نہ دیں گے ہجر کی اس لمبی عدت کو بھی ژاژ

تو کیا ہم بھی مان لیتے کہ غلط ہیں اعلیٰ قدریں دہر کی
تو بنا لیتے کیا ہم بھی سب کی طرح اپنی فطرت کو بھی ژاژ

مانا اِن قطروں نے تیرے سینے کے پتھر کو کاٹا تو نہیں
کہہ نہیں سکتا مگر پھر بھی ظفرؔ لفظوں کی حرمت کو بھی ژاژ



یوں چکا چوند کریں گے تیری زیبائی کے رنگ
آئینہ ڈھونڈتا رہ جائے گا بینائی کے رنگ

ظلمتوں میں نہ کبھی جذب ہوئی فکرِ رسا
شب کی راہوں میں نظر آئے سحر پائی کے رنگ

چھوت جیسی ہے یہ افسردہ مزاجی میری
آ گئے ہیں درودیوار پہ تنہائی کے رنگ

میں نے اس سے بھی کہا نہ کبھی افسانۂ غم
چاند نے دیکھے تو ہیں میری شکیبائی کے رنگ

کر دیا وقت نے احساس پہ کیسا جادو
اجنبی ہو گئے سارے ہی شناسائی کے رنگ

ہم کہ منزل کی سہولت کے تمنائی تھے
آسماں بانٹ رہا ہے نئی پہنائی کے رنگ

اُن پہ بھی جان لٹا بیٹھے ہیں ہم دیوانے
جن زمینوں نے دیے ہم کو فقط کائی کے رنگ

گویا ہم سب کو مصور نے اُدھورا رکھا
کسی تصویر میں دیکھے نہیں یکتائی کے رنگ

کس قدر سچا ہے ہر بار مکر کر بھی وہ
کس قدر جھوٹے ہیں توبہ! میری سچائی کے رنگ



بولیں کبھی خاموش سے ہوئے ہوئے کچھ لوگ
برسوں سے رگِ جاں میں ڈبوئے ہوئے کچھ لوگ

بادل میں سے سورج کی کرن پھوٹی ہو جیسے
ہنس دیتے ہیں یوں پہروں کے روئے ہوئے کچھ لوگ

قائم ہے فقط اِن سے ہی آبادی دلوں کی
یادوں کی لڑی میں ہیں پروئے ہوئے کچھ لوگ

کس طرح نکل پڑتے ہیں اِک لمبے سفر پر
جاں کی طرح مجھ میں ہیں سموئے ہوئے کچھ لوگ

نکلے نہ کبھی پاؤں کے کانٹوں کی طرح سے
اِک عمر سے اِس دل میں کھبوئے ہوئے کچھ لوگ

دیتے ہیں مجھے گرد میں اَٹ جانے کا طعنہ
منہ میرے لہو سے جو ہیں دھوئے ہوئے کچھ لوگ

اے میرے وطن تیری بھی کیا آب و ہوا ہے
اُگتے ہیں فقط گملوں میں بوئے ہوئے کچھ لوگ

اِک فرض ہے جو قرض کی صورت ہے گلے میں
ہم جاگ رہے ہیں کہ ہیں سوئے ہوئے کچھ لوگ



تیرے میرے درمیاں وابستگی کا اِک سوال
اُٹھ رہا ہے تو کروں کیا دلبری کا اِک سوال

بن نہیں پایا فراتِ عصر سے کوئی جواب
ریت پر لکھا ہوا تھا تشنگی کا اِک سوال

منظروں پر راستے چپکا کے اکثر جا بجا
مجھ کو بھٹکاتا رہا ہے آگہی کا اِک سوال

وہ تو اپنے غم کا بھی پرچہ تھمانے لگ گئے
مجھ سے حل ہوتا نہیں ہے زندگی کا اِک سوال

کیوں عبث کرتا ہوں جادہ ناشناساؤں سے میں
سیدھے رستے پر کسی کی گمرہی کا اِک سوال

خود کو تج کر میں نے سب کی آرزوئیں پوری کیں
اور جب میں نے کیا اپنی خوشی کا اِک سوال

کب سے ہے قلب و نظر میں تیرگی کا زنگ سا
کتنی صدیوں سے ہے میرا روشنی کا اِک سوال

کوئی سنتا ہی نہیں ہے سر پٹختی التجا
شور کب سے کر رہا ہے خامشی کا اِک سوال

یوں تو وہ جا بھی چکا لیکن در و دیوار پر
کر گیا چسپاں نگاہِ آخری کا اِک سوال

بھید سارے کھل گئے تھے دیکھتے ہی دیکھتے
اُن کی آنکھوں سے کیا تھا بیخودی کا اِک سوال

کس قدر تیزی سے بھاگے آپ ہم
خود سے کب نکلیں گے آگے آپ ہم

موت بھی آ کر سلا پائے گی کیا
زندگی بھر کے ہیں جاگے آپ ہم

پہن کر نکلے ہیں سب اپنے اصول
اجنبی کیا کیا نہ لاگے آپ ہم

زندگانی ایک سمجھوتہ سا کچھ
اَن دِکھے رشتوں کے دھاگے، آپ، ہم

کس لئے ابلاغ آگ اور خون کا
مل نہیں سکتے تھے واہگے آپ ہم؟

لے گیا ہے خواب کوئی لوٹ کر
جاگنا تھا پر نہ جاگے آپ ہم

کیا دکھایا عشق نے کہ ہیں ظفؔر
اپنی دنیائیں تیاگے، آپ ہم



صرف تم

وہ بھی سندر نار
فتنۂ دلدار
آنکھیں اُس کی بھی
کچھ کچھ تھیں میخوار
جلوہ اُس کا بھی
کاوشِ زرتار
ہونٹوں سے چھن چھن
پھولوں کے انوار

اُس کا پیکر بھی
جیسے کلی کچنار
ہر ہر بات میں تھی
جیون کی چھکار
لیکن میرا بھاگ
صرف تمھیں تھے یار



کھلنے لگے نظر کے بازار از سرِ نو
بن جاتا ہے نیا کچھ ہر بار از سرِ نو

دیووں کی سلطنت میں جینا ہے سخت مشکل
ہم کو بنانے ہوں گے معیار از سرِ نو

جالے زدہ ہوں رشتے تو آئیں کیا فرشتے
روشن ہو کیسے دل کا ہر غار از سرِ نو

ہر داغِ ہجر اب کے کینسر بنا ہوا ہے
اچھے ہوں خاک تیرے بیمار از سرِ نو

یاجوج وقت یوں تو ہر لمحہ چاٹتا ہے
بڑھ جاتی ہے غموں کی دیوار از سرِ نو

موجوں سے کرنی ہے کیا پھر کچھ مصوری سی
ہاتھوں میں لے لیا ہے پتوار از سرِ نو

ہر بام سے چمکتے سورج نکل پڑیں گے
جس دن بھی ہو گی بستی بیدار از سرِ نو

ہر راستے کو جذبِ دل نے بتا دیا ہے
جانا پڑے گا تجھ کو اُس پار از سرِ نو

یا چھین لے زمانے کی گردشوں کو تو بھی
یا چاک پر چڑھا دے اقدار از سرِ نو

سب کو ترے حوالے سے دیکھنا پڑے گا
تجھ سے رجوع کریں گے اشعار از سرِ نو

کہانی تو لکھی بھی جا چکی

کہانی تو لکھی بھی جا چکی کب کی
ہر اک منظر کو ڈھویا جا چکا کب کا
ہر اک کردار کو اس میں سمویا جا چکا کب کا
کسی کو آنسوؤں سے
اور
کسی کو خون کی تلخی سے دھویا جا چکا کب کا
اگر نا مطمئن ہو تم
کہ تم کو اپنی منشاء کا کریکٹر مل نہیں پایا

اگر تم یہ سمجھتے ہو
تمھیں اپنی کہانی میں
کہانی کا کوئی کردارِ دیگر سوٹ کرتا ہے
تو پھر اس کا یہ مطلب ہے
کہ تم اپنی کہانی کو
صحیح سے جان نہ پائے
تمھیں اپنا کریکٹر از سرِ نو پڑھنا ہوگا
اور سمجھنا ہوگا اپنے آپ کو پھر سے
کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا
جو ہونا چاہیے تھا، ہو چکا کب کا
کہانی تو لکھی بھی جا چکی کب کی



خواہشیں پر فشاں بہت سی ہیں
دھوپ میں تتلیاں بہت سی ہیں

فکرِ تعمیرِ آشیاں ہی سہی
ابر میں بجلیاں بہت سی ہیں

بعض چہرے گواہیاں دیں گے
چاند کی جھلکیاں بہت سی ہیں

خوابناؤں میں ڈوبنے کے لئے
وقت کی کشتیاں بہت سی ہیں

تیرا میرا ہے ایک افسانہ
ہاں مگر سُرخیاں بہت سی ہیں

نہیں دلچسپیاں وقوعے میں
بہرِ معجز بیاں بہت سی ہیں

میری خندہ لبی پہ مت جاؤ
طرز ہائے بیاں بہت سی ہیں



ہو گئی جب سے مرے درد کی شدت کم کم
مسکرانے کی بھی رہنے لگی عادت کم کم

بات رہ جائے گی میری، میرے اندر گھٹ کر
اذنِ گویائی پہ ہوجائے گی ہمت کم کم

اب مرا ذوقِ سفر ہی مری انگلی تھامے
راستوں نے مری کرنی ہے قیادت کم کم

میری دوزخ سے تو فردوس کوئی دور نہیں
وقت دیتا ہے مگر سیر کی فرصت کم کم

سانحہ مجھ پہ جو گزرا ہے، کہوں تو کیسے
سنگ باری کی ہے پانی پہ اشارت کم کم

کب سے ملنے نہیں آیا مرے غرفے سے مجھے
چاند کے پاس بھی شائد ہے بشارت کم کم

مجھ سے کیا اپنی صفائی میں کہا جا سکتا
مل رہی تھی مجھے کچھ کہنے کی مہلت کم کم

اب مجھے خود ہی نظر آنا پڑے گا سب کو
شہر والوں میں تو ہوتی ہے بصارت کم کم

میں نے روداد تو خود آپ کی لکھی ہے مگر
آپ نے ایسی پڑھی ہوگی حکایت کم کم

اپنے بارے میں بھلا خاک بتائیں گے ظفرؔ
خود سے کرتے ہیں ملاقات یہ حضرت کم کم

درد آشنا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ
تو بھی سدا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

مفہومِ زیست پائیں مرے دل کی دھڑکنیں
دل کی صدا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

میری ہتھیلیوں کی لکیروں میں ڈوب جا
رنگِ حنا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

تیرے بغیر سخت کٹھن ہے رہِ حیات
ماں کی دعا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

پھر ازسرِ نو عہدِ وفا استوار ہو
پھر ابتدا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

پیغامبر ہوں فصلِ گل و لالہ کا ظفرؔ
موجِ صبا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ



رستہ ہی بدلنا ہے
تو ساتھ کیا چلنا ہے

یارانِ سبک گاماں !!
گر گر کے سنبھلنا ہے

کتنا ہی اندھیرا ہو
سورج نے نکلنا ہے

گردابِ تمنا نے
جیون ہی نگلنا ہے

مدت سے یہی سوچیں
سوچوں سے نکلنا ہے

